مولانا قاری محمد طیب دیوبندی

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

مقالۂ افتتاحیہ

کلمات حکمت

"فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے موضوع پر ہم اہل علم اور اصحاب فکر و نظر کے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ یہ مقالات دسمبر ۱۹۷۶ء کے ایک سیمینار میں پڑھے گئے تھے اس سیمینار کا اہتمام ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی) نے کیا تھا۔ اس کا افتتاح اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد مرحوم نے کیا تھا اور صدارت کے فرائض مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی نے ادا کیئے تھے۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ ایک مدت سے دینی علمی حلقوں کا موضوع بحث ہے اور قدیم و جدید فکر کے حامل تمام علمائے وقت نے اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی سرسید کو مسئلے کی اہمیت کا احساس تھا لیکن وہ اسلامی فکر کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرنے کے بجائے وقت کے مسائل اور انسانی دماغ کی کاوشوں کے سانچے میں اسلامی فکر کو ڈھالنا چاہتے تھے یا انسانی دماغ کے تغیر پذیر اور ہر لحہ تبدیل ہونے والے فیصلوں پر اسلامی تعلیمات اور افکار کو منڈھنا چاہتے تھے۔ علامہ شبلی کے احساس میں چند مضامین میں نمایاں ہوا اور بعض مسائل تک محدود رہا مولانا ابوالکلام آزاد کے اندازِ فکر میں یہ احساس رچا بسا ہے، علامہ اقبال کے ہاں دعوت ہے، مسائل کا حل نہیں، وقت کے مسائل میں اسلامی

فکر کی رہنمائی کا احساس مولانا عبیداللہ سندھی کے بھی شدت کے ساتھ ملتا ہے لیکن حضرات مفکرین کے برعکس ان کی انقلابی روح صرف جمع و تدوین علوم و افکار اور محض علمی اجتہادات کی مشغولیتوں پر قانع نہیں ہوسکتی تھی، ان کے فکر کا شاہین بلند پرواز انقلاب فکر و عمل کے لئے نئی فضاؤں کی تلاش میں مصروف رہا۔ وقت کے تمام افکار و مسائل کی جامع کوئی کوشش اور تحریر نہ تھی اور یہ اہم مسئلہ ابھی تک قدامت پسندی یا تقشف اور تجدد یا بے روک دماغوں کی کاوشوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہے۔

اس موضوع پر یہ پہلا مذاکرہ ہے جس میں فکر اسلامی اور عہد نو کے تقاضوں پر ہر جہت سے تفصیل اور جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے اس سیمینار میں حصہ لینے والے جدید علوم و افکار کے آشنا ہیں جنھیں وقت کے مسائل میں اسلامی نقطہ نظر کی اہمیت کا اندازہ ہے اور قدیم علوم و معارف کے ماہر ہیں جنھیں عہد نو کے مسائل کی نزاکت کا پورا احساس ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے ان مسائل میں ملک و قوم اور ملت کی رہنمائی نہ کی تو ہر مسئلہ اپنا حل خود تلاش کرے گا، وہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی فکر و نظر کے تذبذب کا شکار ہوئے تو زمانہ اپنے سفر میں انھیں پیچھے چھوڑ دے گا۔ مذاکرے کے تمام ہی شرکاء قدیم و جدید مکاتب فکر کے منتخب اہل علم و نظر تھے، ان کے افکار میں گہرائی بھی ہے اور موضوعات و مباحث کو محیط بھی ہیں۔

اس سیمینار میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی نے جو صدارتی تقریر فرمائی تھی وہ نہایت فکر انگیز تھی۔ اس میں حضرت قاری صاحب مدظلہ نے موضوع بحث کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے مذاکرے اور تبادلہ خیالات کے لئے معقول جہتیں واضح کردی تھیں۔ ایک صاحب نظر جنھوں نے حضرت قاری صاحب کے اس خطبے کو پڑھا ہے ان کا خیال ہے کہ اس خطبے کے افکار میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی انقلابی روح کی تڑپ اور زمانہ شناسی کا جوہر بصیرت موجود ہے اور حضرت شیخ الہند کے واسطے سے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے انقلاب انگیز افکار کا اس عہد میں تصرف الٰہی ہے جو حضرت حکیم الاسلام کے حکیمانہ فکر میں ہوا ہے۔ اس لئے ہم اس سلسلۂ مقالات کی اشاعت کا آغاز حضرت قاری صاحب کے خطبہ صدارت سے کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلے میں چند بنیادی نقاط پیش کر دوں جنھیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک ازبس ضروری ہے۔

پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایک ایسی عظیم اصولی بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور اسی کی دست نگر ہیں جو فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں، حواس خمسہ ہوں یا عقل و دانش ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ حدس و تجربہ ہو یا جوہر قیافہ ان سب کا قائد اور محرک فکر ہی ہے پھر یہ فکر نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سرچشمہ ہی ہے بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے، کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہدیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی جاتی ہے لیکن غور کیا جائے تو س سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حد تام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے، کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جوہر غیر انسان حتی کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے، ایک کتے کو بھی اگر یک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آموجود ہوگا، گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اس جگہ پہنچ جانا چاہیئے، یہ صغریٰ کبریٰ لانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے، خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے۔ نیز عرف ام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے جیسے لومڑی اور گدھے اور بھینس کو عام طور سے احمق ر پلید کہتے ہیں سعدی شیرازی نے بھی کہا تھا کہ

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است   چون بار ہمی برد عزیز است

ر کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا ہے کہ

جاموش بے وقوف و بے ہوش   چون شیر دہد تو چشم ازو پوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو ف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق

انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حدّ تام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع ومانع قسم کا تعارف نہیں ہو سکتا، البتہ فکر وتدبر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا نئے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کرلینا، جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا کلیات سے جزئیات نکال لینا اور جزئیات کے عواقب ونتائج کو سمجھنا نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا وآخرہ کو پیش نظر رکھنا نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح ومعاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلا شبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں اس لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فکر مندی، فکر نمائی اور فکر پیمایش اور بھی عمومی اور نوع بشری کے لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات مابعد الموت تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں اس لئے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حدّ تام کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔ پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا ہے، پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل ودانش ذوق ووجدان اور حدس وتجربہ وغیرہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی انہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود ومخصوص دائرے میں کام دی جاتی ہو، بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران متصرف اور ان کی روح ہے جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمایشی کر وفر کا بازار گرم ہو اور باجوں گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں، لیکن راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو، تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں تو فلاں بات کے فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں اس سے واضح ہے کہ آنکھ، کان تو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال وفکر ہی دیکھتی سنتی ہے یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی صورت عقل دور اندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو

لیکن وہ کسی نظریے کی سوچ میں محو تو دوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں نہ وہ انھیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا۔ کیونکہ اسکی قوت فکریہ کسی دوسرے میدان میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس نظرے پر غور کر سکے۔ اس طرح روحانی احوال وکیفیات کا ادراک بھی قوت فکریہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا، اگر غیبی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے، آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے احساس یا تصرف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے، سو یہ قوت فکر کا ہی استعمال نہیں اور کیا ہے۔؟

بہر حال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت کا رپردار صرف یہ فکر ہی کی قوت ہے وہ نہ متوجہ ہو تو قوت باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ اور قوت عاملہ وغیرہ سب معطل رہ جاتی ہیں اس لئے وہ جب محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہر کاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑ پڑتے ہیں، جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے، تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے یہی قوت فکر جب غیبیات کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوت فکریہ نہ صرف یہ کہ انسان کی خصوصیت ہی ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی سلوک ہی اندرونی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرما دیا ہے چنانچہ جو قوتیں ان حسی طاقتوں، آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعے معجزات انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلام کو سنتی تھی مگر رضا و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے اس کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلاتی ہے جو درحقیقت اس قوت فکریہ کی نابینائی ہے ارشاد ہے:۔

فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (بات یہ ہے کہ) ان آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم۔ فکر کی آنکھ

نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ اپنی طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کوئی کام بھی انجام دیے جائیں اس لئے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارگردگی کا انکار کیا ہے۔ جب کہ اس کی غرض و غایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری رُوح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی رُوح نکال کر لاتی ہے۔ ارشاد حق ہے:

ومنهم من يستمعون اليك افأنت تسمع الصم ولو كانوا لا يعقلون ومنهم من ينظر اليك افأنت تهدى العمى ولو كانوا لا يبصرون ۔

اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھے ہیں کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کر) تے ہیں گو ان کو سمجھ میں بھی نہ ہو اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہراً) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں۔ تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو ان کو بصیرت بھی نہ ہو۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکری ہی کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل و ابصار سے تعبیر کیا ہے۔ گویا جس مبصّر اور مسمّع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوت مفکرہ کے غور و فکر سے تعلق ہے تو وہ مبصّر اور مسمّع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے، پھر اس طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق میں فرمایا جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال و افعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس، حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں وہ فکری شعور نہ تھا جو حقیقی معنے میں دیکھنا اور سننا ہے جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے: ارشاد حق ہے۔

لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم آذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون ۔

ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں، ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو یہی لوگ غافل ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ فقہ قلب اصل ہے جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے وہ نہ ہو تو حواس یا کام ہی نہ کرینگے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا، جو غیر قابل التفات ہے، جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس طرح عقل کے بارے میں بھی قرآن حکیم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگذاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوت فکر ہے، عقل محض نہیں، یعنی عقل طبعی کا سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کا فقہی سوچ بچار اس کا منشا نہ ہو جس کا نام فکر ہے تو عقلی شعور بھی بے شعور اور ناقابل اعتناء ہو جاتا ہے چنانچہ ایسے قلوب کو جو بے فکر سے ہوں قرآن نے عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔

ومن آیاتہ یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحیی بہ الارض بعد موتھا ان فی ذلک لایات لقوم یعقلون۔	اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اسی سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیا غبار (زمین) وغیرہ باوجودیکہ آنکھوں سے نظر آنے والی چیزیں ہیں جنھیں سب دیکھتے ہیں، حتیٰ کہ چرند و پرند بھی، اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف و طمع کا اثر بھی لیتے ہیں لیکن فرمایا یہی گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی جو نشانیاں پنہاں ہیں اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے۔ بے فکری اور بے توجہی سے عقل تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے بہر حال حس ہو یا عقل، ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف پیرایوں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لئے انفسی آیات پیش کی ہیں کہیں

آفاقی آیات، کہیں شرعی اور علمی آیات رکھی ہیں، اور کہیں وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا۔

وفی انفسکم افلا تبصرون؟ — تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کروگے؟

کہیں آفاقی آیات پیش کیں جیسے

اولم تنظروا فی ملکوت السموات والارض۔ — کیا تم آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (و فکر) نہیں کرتے۔

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کرکے فرمایا۔

سنریہم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسہم حتی یتبین لہم انہ الحق — ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے۔

کہیں شرعی آیات پیش کیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا۔

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔ — کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔

کہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی تاکہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آجائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں فرمایا۔

قل انما اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ وفرادیٰ ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنۃ ان ھو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔ — آپ فرمادیں کہ اے پیغمبر کہ میں تمھیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور ایک ایک فرادیٰ فرادیٰ اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے ان ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرۃ کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے۔

اولم یتفکروا مابصاحبکم من جنۃ ان ھو الا نذیر مبین

کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنی ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے (آخرہ کے عذاب سے کیا یہ کسی کا مجنون ہے؟)

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو "لُب" کے عنوان سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے منکشف شدہ علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا۔

ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا وما یذکر الا اولوا الالباب۔

جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر دے دی گئی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہوتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ، مگر وہ صورت عقل ہے جو مادۂ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کرلیتا ہے لیکن لُبّ اور لباب حقیقت عقل ہے جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہے، اسی کا نام فکر ہے یہ حکمت جسے خیر کثیر کہا گیا ہے محض عقل طبیعی سے برآمد نہیں ہوتی بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لُب کہا جاتا ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے اس خاص قوت کو جس کا تعلق قوانین الٰہی، معرفت خداوندی، حقائق نبوت اور اس کے الوان کے انکشاف سے ہے جسے صبغۃ اللہ کہا گیا اسی کو کہیں فقہ قلبی سے کہیں لب (عرفانی) سے، کہیں نظر (باطن) سے، کہیں بصیرت سے، اور کہیں "انصباغ من اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں حواس، عقل وجدان اور حدس و تجربے کا کام میں لاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اُس کا مصرف انفس و آفاق تشریح و تکوین اور کمالات ذات و صفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر چشم بینا اور گوش و شنوا کا کام نہیں بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے اور فکر ہی جب ان اعضا حواس وغیرہ کا امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتدا میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر فکر ان میں سے اصولی، کلّی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام کو پہنچ جاتا ہے خلاصہ

یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں فکر ہی انسان کی ظاہری و باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے، اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلیتہً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ اُمّت کے سامنے نہ آسکتیں یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے مگر اجتہاد کی جنس بہرحال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے انکشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے کیونکہ جامعہ کی بنیاد سیدنا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہٗ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم و جدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف علمی و عملی صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں قدیم و جدید کی دوئی کو ختم کر کے انھیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی نہضت اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لئے قرآن حکیم نے فکر کی دعوت دی ہے سمٹ کر جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

۱ اسی لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر کے لئے سب سے پہلے فکر کا ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہیئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں، اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا تشتت افزا اوہام و خیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوۃ ہے۔ جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے پس اس

منہاج سے آج بھی آگے بڑھ کر سکتی ہے۔ اس منہاج کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس امت میں نبی اُمت نے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس فکر جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس نے ابتدائی مراحل سے گذر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈالا۔ غور کیا جائے تو اس منہاج نبوۃ نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دینداری کے نام پر دنیا کو کلیتہً ترک کر کے زاویہ نشین ہو جائیں، شہری آبادیوں، تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ چھاڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو نہ در، نہ معاشرہ ہو نہ معیشت، نہ انسانی روابط ہوں نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو نہ اجتماعیت، کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے نہ اس کا مطالبہ، اور نہ ہی فطرۃ کا تقاضا اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ۔

لا رھبانیۃ فی الاسلام۔ اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا ہے کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبوی سے بیگانہ ہو کر کلیتہً نظام دنیا سنوارنے، جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں۔ اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو۔ نہ عقائد رہیں نہ عبادات، نہ فرائض رہیں نہ سُنن نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن، نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر جوئی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ رات دن ہوائے نفسی کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب عیش و طرب، آرایش و آسایش اور نمایش و زیبایش مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے، سو اسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے فرمایا:

وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے

یعلمون ظاھرا من الحیوۃ الدنیا وھم عن الاخرہ ھم غافلون۔ یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔

وھم یاکلو ویتمتعو یلہھم الامل فسوف یعلمون۔ آپ ان کو ان کے حال پر رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

بلکہ اس افراط وتفریط سے الگ کرکے دنیا کو ترک کرانے کے بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے۔ یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے تمام شعبوں کو زیر استعمال رکھ کر انہی میں سے آخرت پیدا کی ہے چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔

الدنیا مزرعۃ الاخرۃ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے اس لئے اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجر آخرت ہے وہیں حظ دنیا بھی شامل ہے، مثلاً مسواک میں ثواب آخرۃ ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیش نظر ہے۔ اگر طیبات رزق میں بہ نیت حسن عبادت کی قوت رکھی گئی ہے تو وہیں کام و دہن کے ذائقے سے اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے اگر لباس میں بہ نیت آخرۃ وعزت حیا وستر عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسن دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے، اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر ونخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت بھی اختیار کی گئی ہے، جو دنیوی مفاد ہے، اگر تخت شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظ ملک، خدمت خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرۃ اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار وعزت اور سیادت وقیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے۔ بہرحال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب واکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے صاحب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا ہے کہ

فکر دنیا کن واندیشۂ عقبیٰ مگذار تا بعقبیٰ نہ رسی دامن دنیا مگذار

غرض منہاج نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس اُمت کو ڈھالا ہے کہ جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں اس لئے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیب نفس، تدبیر منزل، سیاستہ مدن، تسخیر اقالیم، تعظیم امر اللہ، شفقت علی خلق اللہ، نظام اجتماعیت، جماعتی تنظیم ومرکزیت اخلاق

وایثار کی منظم تربیت، نظام عبادت، نظام امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکر آخرۃ اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ سے رنگا گیا ہے تاکہ یہ قوم جامع دین و دنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد مقلد اور متقدی بنے اسے خود دار بنا کر امام اقوام اور داعی حق وصداقت کی حیثیت دی گئی ہے۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام
اُن کی اُمت بھی ہے دُنیا میں امامِ اقوام

پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوۃ کو سمجھ کر ایک نئی ترتیب اور نئے رنگِ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا، اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید، تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافتِ الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے، اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔ اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوۃ کے تمام عقائد واحکام اخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں، تاکہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما ہو، ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انھیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی اگر ایک شخص سائنس کے فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو، یا منطق و فلسفہ کے فکر کی تشکیل کے لئے صرف ونحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس کی تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اس سے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا تاکہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد ومقاصد تک پہنچا ہوا ہے، یہ اصول وقواعد ہی درحقیقت

منہاج نبوۃ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہو، اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد وضوابط قائم نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔ البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کردی ہیں، اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا البتہ معاملاتی معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے اولئے بدلتے رہتے ہیں اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان فرمائی ہیں۔ اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جس میں اصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے اس لئے ان میں بہر حال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی جسے مبصر علما کی بصیرت ہی حاصل کرسکے گی، جیساکہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے بس ایک مسلم کو اجتہاد کی اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے۔ خواہ وہ اتباع جزئیات کا ہو جب کہ وہ منصوص ہوں، یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ اجتہادی ہوں جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہوتا ہے جس کے ذریعہ یہ جزئیات باہر آتی ہیں اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات وجزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ تشکیل جدید وترتیب عمل آسکے گی، نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ وہ اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہوسکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہوسکتا جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے یہی صورت شریعات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہوسکتی بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ جن اصول کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انھیں کوئی تعلق نہ ہو اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے انھیں پسند نہیں کیا کہ اُن میں زیادہ غور وخوض کیا جائے، مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ اور حقائق کے پیچھے مت پڑو۔

یسئلونك عن الاهلة قل هی آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ

مواقیت للناس الحج ۔ فرمادیجئے کہ وہ آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کیلئے۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرمادیا گیا کہ تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔ یہ حقائق یا تو وہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔ آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یا اس طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمادیا گیا کہ تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں، صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔

یسئلونك عن الساعۃ ایان مرسھا فیم انت من ذکراھا الی ربك منتھاھا۔ یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے۔

بہرحال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب ہے اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو، اور سعادۃ دارین حاصل ہوتی ہو۔ بہرحال عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عمل ہی سے بنتی ہے جس کے بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے اس لئے کسی مربی نفس یعنی ربانی کی تفسیر ابن عباس نے الذی یربی الناس بصغار العلم ثم بکبارھا سے کی ہے یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداءً چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے اس لئے قرآن حکیم نے تذکیر و موضوعات اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت و سلطنت) کی بنیادی غرض و غایت ٹھیرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہو تاکہ علم و عمل دونوں جمع ہو سکیں، کہ اس کے بغیر ہمارا فکر اور اس کی تشکیل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل یہ ہے کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے البتہ وقت کے مناسب اور آج کے

دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح و انتخاب جدابات ہے۔ وہ اہل علم کا کام ہے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت اور وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے بھی معقول اور دل پذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں ان کا حقیقی مفہوم واشگاف نہیں ہو سکتا، ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت و شکل سامنے آسکتی ہے، اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعۂ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیر ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے ورنہ اصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، اس سے بھی ان حوادث و واقعات پر بھی روشنی پڑھ سکتی ہے جو ان جزئیات کا استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہاء امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانیت ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان و مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں اس سے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہو سکتیں۔ اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضروری ہی کیا جا سکتا ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں بھی سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں، اور حالات کا پورا مقابلہ کر سکیں، ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش و جستجو کی ہوگی بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوۃ سے زیادہ قریب ہوں گی اس لئے بجائے اس کے ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں، پھر بھی اگر کسی مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو یہ جزئیات سابقہ ہی کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کر سکیں گی بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑا ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ فقہاء امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کر کے جمع کر دیے ہیں جس کے مجموعے سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا، جس میں ہر شعبۂ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود اس لئے فکر کی تشکیل میں

قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے دینی جزیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن واستہزا کی وجہ سے کبھی ترک کو ناگوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا، حضرت سلمانؓ نے اسے فوراً اٹھاکر اس کی گرد جھاڑی، صاف کیا اور تناول فرمالیا، غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں، دولت مندوں اور سیر چشموں کا ہے وہ حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے، فرمایا " أترك سنة حبيبي لهولاء الحمقاء ؟" (کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کردوں؟) غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزیہ کی یہ پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات، خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر وطعن، لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا، آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا، مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات اور توسیع فتوحات میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال وحوادث کے پیش نظر توسع وہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوی یا مجبوری یا آج کل کی اصلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کرکے سپر ڈالی، دوسری یہ بات بھی اسی واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق ومحبت ہے، جو ذات حق، ذات نبوی اور ذوات صحابہ سے وابستہ ہے اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لئے بھی نظر انداز نہیں کرسکتا جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں "حبیبی" کا لفظ استعمال فرماکر اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانون عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا ہوتا، اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں

شکر گھل جاتی ہے ، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزئیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور وہ ان سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا ، اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اسی انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادیٔ ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی اس قانون حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے سے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کرسکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارۂ کار نہیں ہوتا۔ اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامت صغریٰ ہے جو کلیتہً امامت کبریٰ یعنی امارت و خلافت پر منطبق ہے ، وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے ، وہاں اگر جہاد میں ہر نقل و حمل پر نعرہ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے ۔ وہاں اگر امام کے حق میں سمع و طاعتہ فرض ہے تو یہاں بھی ہے ، وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے ، وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے ، وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی ملامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ ، اس لئے اس امام صغریٰ (جماعتہ صلوۃ) کے جو طور و طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامتہ کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں ، اس میں صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدیوں کو امام کا پابند بھی انتہائی طور پر کیا گیا ہے کہ مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہو سکتی ، چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں ، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں ، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں ، وہ قومہ میں جائے تو یہ بھی قیام کریں ، سجدے میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں ، وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں ، حتیٰ کہ امام سے اگر سہواً کوئی جزوی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ سجدۂ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں ، لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرات یا افعال صلوۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرلے یا کسی رکن میں غلطی ہو جائے تو اسے درست نہ کرے ، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر و تسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہو جائے ، بعینہٖ یہی صورت امامتہ کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی ہے کہ امیر المومنین کی سمع و طاعتہ تو ہر ہر معاملے میں واجب

ہے ورنہ تعزیز و سزا کا مستحق ہوگا، لیکن ساتھ ہی خود امیر کی خطا و لغزش پر ایک عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرلے یا اس کا کوئی صحیح عذر سامنے نہ رکھے،

فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ امیر المومنین ممبر پر کھڑے ہوکر خطبے میں اعلان فرما رہے تھے کہ لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو، اعرابی نے کہا کہ نہ ہم بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے، فرمایا کیوں؟ کہا کہ مال غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں، فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ ابن عمرؓ) دے گا، صاحبزادے نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا تھا ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کردی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انھوں نے آج استعمال کی ہے، تب اعرابی نے کہا کہ اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے، منہاج نبوۃ کے مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزیئہ میں ڈھیلاپن گوارہ نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ ایک عامی آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگذاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا، لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کردینا قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جب کہ انہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالم گیر بنی، آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالم گیر دین ہونے کے مدعی ہیں، تو اس کی ہمہ گیری کے معنی اس کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں، اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالم گیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہوسکتا لیکن جب انہی اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے تربیت پاکر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھری جنھوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی، اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن نہ تھا، اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں ہی کی تنگی ہی کی علامت ہوسکتا ہے فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جاسکتا، بالخصوص جب کہ ان اصول کی وسعتوں میں ایسی گنجائشیں بھی رکھی گئی ہیں کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم و فضل نے استخراج

مسائل کی حد تک کام بھی لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے، اس لئے تمدن و معاشرت کے مشخص عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا، بلکہ اسے وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے جو ہر زمانے میں نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انھیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کرکے ان کے احکام نکال سکتے ہیں جیسا کہ مفکران باب فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے، بالخصوص مسائل کے طرز استدلال کے بارے میں تو خاص طور ہر قرن میں جدید رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں، ایک دور میں نظری فلسفے کے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک کہ وہ عقلی چولے میں نہ آئے تو رازی و غزالی جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرکے لوگوں پر حجت تمام کی، ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربی وغیرہ نے صوفیانہ اور عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا، ایک دور میں معاشی فلسفے کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا اور وقت کے مسائل کئے، ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو مشاہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کرکے اتمام حجت فرما دیا، جس سے ایک طرف اگر اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بہ دستور حقیقت رہتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں سارے الوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس اس پر زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو در حقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں، آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی، اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا تو وہ عوام کے لئے قابل التفات نہیں ہوتا اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ ہوگا، بلکہ اس کے اندر کا ہوگا،

حالات محرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و معیشت کو نمایاں کریں گے، اگر اس میں سیاست اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنھوں نے دین و دیانت کے غلبے کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دے، اور آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمان روائیوں کے ثمرات ہیں، جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل ہیں البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کی حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا، اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اسی کی تقلید پر مجبور ہوتی، نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

بہر حال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہ قائم رکھ کر جس میں دیانت و سیاست اور عبادت و مدنیت بیک وقت جمع ہے وقت کے مسائل کو نئی تشکیل و ترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی، جب کہ اس میں فقیہ المزاج ہی شخصیات اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت اسلامی مزاج کی برقراری سلف صالحین کا اسوۂ مرادات خداوندی کے ساتھ تقدیر رضا حق کی پاسداری، اجتماعی صلاح و فلاح، اخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جاویں کی تو بلاشبہ "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" اپنے ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آجائے گی، مگر اس کے ساتھ منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر و تفقہ مزاج کی ضرورت ہے جس کی تفصیل عرض کی گئی وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور وقت کو بھی پہنچانتے ہوں، عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں بھی انھیں مہارت و حذاقت میسر ہو دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن وہ سمجھتے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں، کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاوی ہیں، اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی نوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کچھ مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں

حذاقت و مہارت کے حامل ہوں، عموماً اور اکثر و بیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناگوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر و بیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علما کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے کہ جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی، اور دوسری طرف ماہرین عصریات جب کہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کی شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض ان کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کی حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ تمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا، ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائروں میں غور و فکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکر واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع مفکروں کو کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگا جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا، اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا نیز ایک طبقہ کا ہدف طعن و ملامت نہ بن سکے گا، اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سد راہ نہ ہوگا۔

البتہ مفکرین کو یہ ضرورت پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے، اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی کی شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے، اور انھیں تنگی اور ضیق و حرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں، وہیں رضا خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے اس لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلہ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے حال کے معنی ہی ما حال فقد زال کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) پس حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرہ بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے، البتہ ان شرعی اصول میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کر سکیں، اس لئے

مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلتے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثے کے بارے میں منہاج نبوت نے اصولا یا جزا وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دینا ہے، نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں جزئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے، کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

فی زماننا اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کی بوچھار کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کی سیاسی نظریات دماغوں میں مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں، آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی معاشی، اور قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتیٰ کہ عقائد بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی۔ چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی وہی ٹھہر گئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ فلاں نظریئے پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی، اس لئے آج ایک سیاسی "ملل ونحل" کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد وافکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند مفکر گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں کیونکہ قدیم زمانے کے "ملل ونحل" اس کے پیدا شدہ مذہبی عقائد وافکار کے پیش نظر مرتب ہوئے تھے جب کہ عموماً دلوں پر مذہب اور دین کی چھاپ پڑی ہوئی تھی آج جب کہ دلوں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے ہیں تو عصر حاضر کے سیاسی عقائد وافکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل وشواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے آج جب فکر اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ اٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ اس سیمینار کے ثمرے کے طور پر اس سیاسی معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی "ملل ونحل" کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے گی، حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی مسائل کی جو نوعین ابواب وفصول کے ساتھ جن جن عنوانات سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیۃ حاوی

ہیں اور ان میں فقہائے امت کے دل و دماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کا تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر علمی اور فکری سعی کا محور بنالیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آجائیں گے اور دوسرے مہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی "ملل ونحل" تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگا

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہیئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری ماسٹاک ایکسچینج وسودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی کیونکہ فکر اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جارہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہیئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آجانے پر یہ شبہہ بھی حل ہو جائے گا کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہے، جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ اسے توڑنے والا تو اسلام ہے جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے، اسلام نے اپنے اصول فطرت میں ماننے کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں لیکن اصول فطرۃ میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاج نبوت کے اساسی اصول

منفی پہلو

(۱) لا اسلام الا بجماعۃ — اسلام بغیر جماعت کے نہیں۔

یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسندانہ ہے انفرادیت پسندانہ نہیں۔

(۲) لا رھبانیۃ فی الاسلام — یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی کا ہے، نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے۔

(۳) لا اکراہ فی الدین — یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر و اکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی

محبت کے ساتھ حجت و برہان سے حق واضح کر دینے کا ہے
ماننا نہ ماننا کلیتہً مخاطب کا اختیاری فعل ہے۔

(۴) لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام — یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی کا نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے۔

(۵) لا عدویٰ ولا طیرۃ فی الاسلام — یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لینا اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہیں کہ امور واقعیہ ہی اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں، خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پزیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہماتی خطرات ووساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث سے ان کا تعلق ہو۔

(۶) لا نولی امرنا ھذا من طلبہ — یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے گویا عہدوں کی طلب خود غرضی کی دلیل ہوتی ہے، اور خود غرضی انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادتاً قاصر رہتا ہے۔

(۷) لا تکلف نفس الا وسعھا — یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بار رکھنا اُس کے نزدیک ظلم ہے

(۸) لیس منا من غشّنا — یعنی اسلام کا مزاج گندم نمائی جو فروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر دغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے،

(۹) وما انا من المتکلفین — یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمایش پسندی کا نہیں بلکہ سادگی، سچائی اور ظاہر و باطن کی یکسانی کا ہے۔

(۱۰) لا نفرق بین احد من رسلہ — یعنی اسلام کا مزاج شخصیات مقدسہ کے نام پر تعصب، تنگی، حد بندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے

اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے۔

(۱۱) لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوۃ یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہمت مردانہ دکھلانے کا ہے۔

(۱۲) لاتیئسوا من روح اللہ۔

یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آجائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید، بھروسہ اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات و استقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے، مایوسی اس کے نزدیک کفر کا شعبہ ہے

(۱۳) ماجعل علیکم فی الدین من حرج۔

اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے۔

(۱۴) لن یشاد الدین الا غلبہ

یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو مبالغہ اور تحمل بے جا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹا دے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے توسط و اقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے۔

(۱۵) ولا یجرمنکم شنأن قوم علی ان لا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔

یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلاف عدل اور خلاف تقویٰ ہے۔

(۱۶) لیس للانسان الا ما سعی

یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اس کی سعی کام دے گی، دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تاکہ آدمی دوسروں پر تکیہ کر کے معطل نہ ہو بیٹھے، ہمت سے خود آگے بڑھے۔

مثبت پہلو۔

یہی صورت اسلام کی اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے مثلاً۔

(۱) لیھلک من ھلک عن

یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی حجۃ طلبی اور تحقیق حال کا

بینة و یحیی من حیّ عن بینة	ہے جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں۔
(۲) والصلح خیر واحضرت الانفس الشح۔	یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے لڑائی، جھگڑے شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جود و کرم کا ہے بخل تنگی اور جز رسی کا نہیں۔
(۳) واصبر علی ما اصابك ان ذلك من عزم الامور۔	یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندانہ نہیں بلکہ کریمانہ اور مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبر و تحمل اور عفو در گذر کا ہے۔ اس کو اس نے اولعزمی کہا ہے۔
(۴) انما المومنون اخوة۔	یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور ملنساری کا ہے اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں۔
(۵) ان الناس کلهم اخوة۔	یعنی اسلام کا مزاج عالمی بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو، غلام سازی یا استحصال عوام اور گروہ سازیوں کے ذریعے بھائی کو بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں۔
(۶) من قتل نفسًا بغیر نفس فکانما قتل الناس جمیعا۔	یعنی اسلام کا مزاج پورے عالم انسانیت کے احترام و تحفظ کا ہے انسانیت کی تحقیر و تذلیل اور لاپرواہی سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں۔
(۷) ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلك سبیلا اولٰئك هم الکٰفرون حقًا۔	یعنی اسلام کا مزاج خلط و التباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضا جوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بین بین راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے۔
(۸) ادخلوا فی السلم کافة۔	اسلام کا مزاج دائرۂ حق (اسلام) میں پورے پورے داخل کرلنے اور یک رخی کے ساتھ دلوں کو سکون و اطمینان بخشنے کا

ہے ناتمام اور ادھ کچرے کام سے دلوں کو ڈانواڈول کر دینے کا نہیں۔

(۹) ان تؤدوا الامانات الی اھلھا

یعنی اسلام کا مزاج امانت داری اور امانت سپاری ہے بد دیانتی خیانت پسندی یا دخل فصل کا نہیں۔

(۱۰) ویقولون سمنا واطعنا

اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیام امارت پر امیر کے حق میں سمع وطاعت کا ہے اگر ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے لامرکزیت یا فوضویت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں کہ یہ انتشار پسندی ہے۔

(۱۱) کل امرءٍ بما کسب رھین

اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر اُبھارنا ہے تاکہ وہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے۔

(۱۲) من یعمل سوءً یجز بہ

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا۔

(۱۳) ثلثۃ لعنھم اللہ (ومنھم) مبتغ فی الاسلام سنۃ جاھلیۃ

یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹا دیا ہے ان کا اعادہ یا نئی نئی بگڈنڈیاں نکالنا اس کے لئے قابل برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے۔

(۱۴) ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ فانتھوا۔

اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے قانون حق میں ایجاد اختراع کرانا نہیں۔

(۱۵) الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (اور) ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاخرۃ۔

اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ وہ عبادۃ ہو یا عادۃ اخروی بنانا ہے دُنیا پر ختم کر دینا نہیں ہے نہ دنیوی مفادات کو اصل رکھنا ہے مگر دُنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کر کے اس میں سے آخرت نکلوانا ہے، اس لئے دنیا کو کھیتی کہا ہے، پس پھل اگر ضروری ہے تو کھیتی کرنا بھی ضروری

ورنہ پھل نہیں مل سکتا، پس اسلام کے مزاج میں ترک دنیا نہیں بلکہ ترک محبت دنیا ہے، اس لئے کہ یہ ساری دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جاسکتی اور انسان آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔

بہر حال کتاب وسنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی، مرکزیت امارت، سمع وطاعۃ، تفویض، عہدہ جات کی نوعیت عوام کا طرز تربیت اخلاقی بلندی عملی جوش معاشرت کا ڈھنگ دین کی وسعت خلط والتباس سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات ومحدثات سے گریز، اتباع رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل وانصاف، خدمت خلق، دنیا کا آخرت سے ربط، اور آخرت کی مقصودیت وغیرہ امور ہیں، جن سے منہاج نبوت کا ذوق اور اسلامی مزاج کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آئیں ورنہ کتاب وسنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں، ہمیں اپنی تشکیل نو میں ان سب کو بہر حال سامنے رکھنا ہے۔ لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم اقدام یا پہلا قدم رجال کار کا انتخاب ہے جو دین میں مبصر اور فقیہانہ شان رکھتے ہیں بحیثیت مجموعی دین کے اصول وفروع ان کے سامنے ہوں اسلام کی حقیقی روح ان کی رگوں میں پیوست ہو اور اسلام کی وہ حکمت عملی ان کے پیش نظر ہو جس کے لئے اللہ کی طرف سے اس دین کی تشکیل عمل میں آئی ہے اگر رجال کار ناواقف یا غیر فقیہ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمت عملی سے نابلد یا روح اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکر اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہوگی اس لئے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کے ہے، حق تعالیٰ نے بھی جب اس دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس سے واضح ہے کہ دینی ہدایت کے لئے شخصیتوں کا انتخاب اہم اور اقدام ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم وتکفیر کے لئے نہیں بلکہ تربیت کے لئے آتا ہے اور تربیت محض کاغذ یا کتاب کو نوشتوں سے نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں کرنے والی سامنے نہ ہوں، اس لئے دنیا کا کوئی بھی دور ایسا نہیں گذرا کہ امتوں

کی صلاح و فلاح کے لئے محض قانون اتار دیا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اسی حکمت علمی سے پیش کرسکتی ہے جو شارع حقیقی حق تعالیٰ شانہ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ اس لئے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لئے منتخب کی جاتی ہے کیونکہ ہر دور میں اس رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اس نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا۔ جو نوعیت اس دور کے ذہن و مزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہو چکی ہے تو انبیاء کا کام اس اُمت کے مجدّدوں اور مفکر علماء و عرفا کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کرکے دلوں میں جمائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرین نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں، ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ

ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم (مشکوٰۃ)

یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں یہ فکر) ہی تمہارا دین ہے تو یہ دیکھو کہ کس (شخصیت) سے تم دین (یا فکر) اخذ کر رہے ہو۔

جن سے دین اور دین کے فکر کے بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو وہی قلوب کی صحیح رہنمائی کرسکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کا فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب کا کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب و سنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لاکر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنا اپنا فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں درآنحالیکہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق و صواب پر ہو سکتا ہے سب کے سب اس تضاد فکر ہی کے ساتھ محق نہیں کہلائے جاسکتے، ظاہر ہے کہ کتاب و سنت سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ مبطل ہو سکتا ہے تو اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیحہ اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے مبطل ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب و سنت یا دینی لٹریچر نہیں بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوقِ سلف پر تربیت

یافتہ شخصیت نہیں، بلکہ کوئی مبطل اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے پس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی کو سامنے لے آئے گی اور وہی فاسد الفکر ہو تو قرآن و حدیث سے وہ باطل ہی نمایاں کر کے قلوب کو فاسد کر دے گی ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی مبطل فرقہ مبطل نہ ہوتا، اس لئے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح الفکر شخصیات ہی کا ہے جس سے منہاج نبوت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آجائے اور اس سیدھے منہاج پر ہمارا فکر استقامت کے ساتھ رواں دواں ہو۔

بہر حال فکر اسلامی کی تشکیل نو قابل تبریک ہے جس کا سہرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سر ہوگا۔ لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشانہ فکر تعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوت ہے، دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے لئے اس کے اصول و قواعد درکار ہوں گے جس میں قواعد کلیتہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں، تیسرا قدم اس منہاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملت اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آرہی ہے، چوتھا قدم رجال فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور صاحب فکر ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلت وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی اجمالی فہرست ہی پیش کر سکا تھا۔ جو یقیناً تشنہ تفصیل تھی اور اب مقالے کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کر رہا ہوں تو قلت فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیلی اور مرتب شدہ نہیں ہیں بلکہ کثرت مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آتی رہیں انھیں کو عجلت کے ساتھ جمع کر دیا گیا جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہو سکتی ہے، نہ نظام کلام کی۔ اس لئے اسے جہد العقل وھوعہ کا مصداق سمجھنا چاہیئے جو ادائے فرض تو ہے مگر لوازم فرض سے آراستہ نہیں ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام احسن تک پہنچائے اور ملت اسلامیہ کے لئے ایک نافع قدم ثابت فرمائے۔ آمین۔